https://doi.org/10.58352/tis.v48i1.923

The Islamic Culture
Bi-Annual Research & Refereed Journal
Published by
Sheikh Zayed Islamic Centre,
University of Karachi
SZIC
الثقافة الإسلامية
ISSN (Print) : 1813-775X
ISSN (Online) : 2663-1709

مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی و دعوتی افکار کا جائزہ: ہم عصر مفکرین سے امتیازات و خصوصیات

AN ASSESSMENT OF THE REFORMIST AND MISSIONARY IDEAS OF MAULANA SYED ABUL HASAN: DISTINCTIVE FEATURES AND QUALITIES IN COMPARISON TO .CONTEMPORARY THINKERS

Dr. Bibi Alia
Post Doc Fellow, Islamic Research Institute, IIUI, Islamabad

Dr. Hafiz Aftab Ahmed
Assistant Professor, Islamic Research Institute, IIUI, Islamabad

Abstract:

Maula Abul Hasan Ali Nadwi, may ALLAH bless him and grant him peace, is a learned, trustworthy and representative scholar of Islam. He was simultaneously a thinker, a reformer, a leader, a scholar of the 20th century, a writer and a speaker at the same time. Allah had blessed him with a large portion of understanding and wisdom. He was a prolific writer in Arabic. He made the Arab world believe that even today the Arab world is passing in the scientific and religious development of the subcontinent. He rejected the propaganda that there are no more Muslims in India. Also, he informed the Arabs about the Islamic history of India. He undertook the unity and consensus of the Nation of Islam and highlighted all global issues including Palestine. The call to stick to Islamic civilization was the mission of his life. Ali Mian exposed the hollowness of the materialistic development of the West and proved that Europe has become devoid of morals. Only Islamic moral values can save the world from all crises. Mulana R.A blocked the way of efforts to undermine the intellectual and moral values of the Islamic world by being influenced by the material development of the West. Wherever such attempts were made in the Islamic world, they were strongly criticized and all energy was spent on making Muslims adhere to Islamic values. He appreciated the Islamization efforts in Pakistan and India. Here he gave a full and reasoned answer to the opinions of westernized thinkers. He was

introduced Allama Iqbal to the Arab world and spread his religious values and Islamic thought and philosophy throughout the world. He was also convinced of jurisprudential expansion. He appreciated the amendments in jurisprudence, realizing the conditions of the new era. Due to the intellectual and practical expansion of Maulana, where he had a distinct position compared to his contemporary thinkers, due to the diversity of his topics, his opinion or grasp of the topic is sometimes superficial and sometimes strong. In this article we have discussed Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi's distinguish way of Criticism and a review of the prose narrative has also been presented.

Keywords: Abul-Hasan Nadvi, Muslim Ummah, Arabs, Life and Thoughts, Distinguish Way of Criticism

مولانا سید ابو الحسن ندووی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ایک علمی خاندان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی وطن تکیہ، رائے بریلی میں حاصل کی۔ اس کے بعد عربی، فارسی اور اردو میں تعلیم کا آغاز کیا علی میاں نے مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لکھنؤ میں واقع اسلامی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا۔ اور وہاں سے علوم اسلامی میں سند فضیلت حاصل کی۔[i]

آپ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کے والد گرامی عبد الحئ حسنی ؒہندوستان کے چوٹی کے اصحاب فضل و کمال میں سے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، مثلاً "نزہتہ الخواطر (الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام) جو کہ آٹھ جلدوں میں بڑا قیمتی موسوعہ ہے ۔ مولانا علی میاںؒ کے والد آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک عربی سوانحی دائرۃ المعارف لکھا تھا، جس میں برصغیر کے تقریباً پانچ ہزار سے زائد علما اور مصنفین کے حالات زندگی موجود ہیں۔ الثقافتہ الاسلامیۃ فی الہند، ایام تہذیب الاخلاق، اور گل رعنا" وغیرہ مشہور تصانیف ہیں۔

حضرت کی والدہ محترمہ جن کا اسم گرامی سیدہ خیر النساء ہے، وہ ایک شاعرہ بھی تھیں اور اپنا تخلص "بہتر" استعمال کرتی تھیں جو کہ یقیناً ان کی شخصیت کی مکمل عکاسی کرتا ہے، ان کی تصانیف میں "ذائقہ اور حسن معاشرت" بہت معروف ہیں۔[ii]

ابتدائی تعلیم وتربیت:

حضرت ندوویؒ کی ابتدائی تعلیم تو دراصل والدہ کی گود سے ہی شروع ہو گئی تھی، نمازوں کی پابندی، تلاوتِ قرآن کا شغف، دینی علوم سے خاطر تعلق، انگریزی میں حد سے زیادہ انہماک سے بچاؤ، کبر و نخوت سے اجتناب، دوسروں کی حقارت اور ان کی ایذا رسانی سے بچنای، یہ سب بتدائی تعلیم کا ہی اثر تھا، حضرت نے جن اساتذہ سے کسب علم کیا وہ ماہر فن اور اپنے دور کے یکتائے روزگار تھے، عربی تعلیم مولانا عرب خلیل صاحب رحمۃ اللہ سے حاصل کی، اپنے ایک قریبی رشتہ دار مولانا عزیز الرحمن حسنی سے ابتدائی کتابیں نحو میر، میزان وغیرہ پڑھیں فارسی کی کتابیں بوستاں وغیرہ اپنے عم محترم سید محمد اسماعیل رحمۃ اللہ سے پڑھیں، خوشخطی، حساب اور اردو وغیرہ کی مشق ماسٹر محمد زمان خان رحمۃ اللہ سے کی، اپنے برادر کبیر ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ سے انگریزی و عربی میں استفادہ کیا، علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی رحمۃ اللہ سے بھی استفادہ کیا، دیوان نابغہ انہی سے پڑھا اور ادب عربی کی تدریس کے اصول بھی انہی سے اخذ کئے، سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ سے ندوہ میں تدریس کے دوران فلسفہ قدیم پڑھ کر یونانی فلسفہ سے آگاہی حاصل کی،

تفسیر قرآن میں آخری پارے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ کے جانشین حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ کے شاگرد رشید خواجہ عبدالحی فاروقی سے پڑھے، یہیں پہلی بار آپ نے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ کا تذکرہ سنا اور ان کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ ان سے کسب فیض بھی حاصل کیا، اور دارالعلوم دیوبند میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ سے حدیث شیخ الادب مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ سے فقہ اور قاری اصغر علی رحمۃ اللہ سے تجوید پڑھی، ندوہ میں طالب علمی کے دوران مولانا حیدر حسن خان ٹونکی رحمۃ اللہ سے صحیح بخاری شریف صحیح مسلم، ابوداؤد اور ترمذی حرفا حرفاً اور سبقاً پڑھیں اور انہی سے بیضاوی اور منطق کے اسباق بھی باضابطہ پڑھے۔[iii]

سلوک وطریقت:

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ سے آپ کی واقفیت تو تھی ہی لیکن پہلی باضابطہ ملاقات مئی ۱۹۲۹ میں ہوئی دوسرے سال ۱۹۳۰ میں دوبارہ حاضر ہو کر مستقل وقت لے کر سورۃ بقرۃ کا شروع کا حصہ پڑھا، پھر ۱۹۳۱ میں حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شریک ہوئے اور خوب استفادہ کیا اس دوران آپ کے دل میں حضرت سے اصلاح وتربیت کے مستقل تعلق کا جذبہ پیدا ہوا تو ان سے درخواست کی حضرت نے فرمایا میرے شیخ ومرشد حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ بقید حیات ہیں ان کی خدمت میں خط لکھ دیتا ہوں آپ دین پور شریف (خانپور) چلے جائیں اور ان سے بیعت ہو جائیں چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، حضرت خلیفہ سے بیعت ہوئے اور ایک گہرا اثر لے کر واپس آئے، ادھر تفسیر کے اسباق میں حضرت لاہوری سے تعلق بڑھتا گیا اور شفقت ومحبت میں بھی اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ حضرت لاہوری نے ان کو اپنی خلافت عطا فرمائی۔[iv]

مسلک ومشروب:

حضرت کا مسلک ومشرب حنفی تھا، دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا مسلک ومشرب تو واضح ہی ہے ندوہ میں آپ کے بڑے استاذ حضرت مولانا حیدر حسن صاحب تھے جو پکے حنفی عالم تھے، امام اعظم رحمۃ اللہ سے ان کی محبت وعقیدت اور مذہب حنفی لگاؤ عقیدہ کی حد تک پہنچا ہوا تھا، حتیٰ کہ بعض اوقات امام اعظم رحمۃ اللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے، حنفی مذہب کو اقرب الی الحدیث سمجھتے اور ثابت کرتے تھے، ساتھ ساتھ ہی حدیث کی ضرورت اور حجیت کے بھی قائل تھے یہی ان کا اعتدال تھا جو علی میاں میں منتقل ہوا، چنانچہ آپؒ پکے حنفی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ وسیع الذہن رہے، اور اسی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہوا کہ مولانا نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا تھا لیکن یہ محض ایک گمان اور حضرت پر افتراء ہے وگرنہ آپ آخر عمر تک پکے حنفی ہی رہے۔ تقلید کے مسئلہ میں مولانا صاحب بہت معتدل نقطہ نظر رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نقطہ نگاہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے ہم آہنگ تھا اور حضرت شاہ صاحب کے نقطہ نظر کو ندووی صاحبؒ نے نہایت تحسین واستحسان کے انداز میں بیان فرمایا ہے، ان کی رائے تھی کہ شاہ صاحب غایت انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معین امام کا مقلد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباعِ نبوی ﷺ ہے لیکن وہ اپنے اندر اسکی اہلیت نہیں پاتا وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب وسنت ثابت ہے اس تک براہ راست پہنچ جائے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً وہ عامی شخص ہے۔ یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے وسائل یا فرصت نہیں، یا ایسے وسائل (علم وتحقیق) حاصل نہیں

جن سے وہ نصوص کا معلوم کرے یا ان سے مسئلہ استنباط کرلے مولانا صاحب متعدد جگہوں پر حضرت شاہ صاحب محدث دہلویؒ کے معتدل نقطہ نظر کی تمہید بیان کرتے ہیں۔[v]

ادبی زندگی کا آغاز:

۱۹۳۷ء تک حضرت کا مطالعہ علمی میدان میں ٹھاٹھیں مارتا رہا لیکن اس کے بعد تفسیر و حدیث، تاریخ و ادب کے دائرے سے باہر نکلا اور اس میں آپ کے معاون برادر بزرگ اور مربی ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ ہیں وہ چونکہ عربی رسائل و اخبارات کے از حد شوقین تھے اس لئے ان کے پاس عربی رسائل و اخبارات کا انبار ہوتا تھا، مولانا نے ان کی مدد سے اخبارات پڑھنے شروع کئے، رفتہ رفتہ تعبیر و اظہار خیال کی وہ قدرت نصیب ہوئی جو کسی اور کتاب سے حاصل نہ ہو سکتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مضامین لکھنا شروع کئے ۱۹۳۲ء میں ندوہ سے عربی رسالہ "الضیاء" شائع ہونا شروع ہوا تو اس نے حضرت کے ادبی ذوق کے لئے مہمیز کا کام کیا اور اس سے قلم میں سیلانی اور جولانی پیدا ہوئی، عربی ادب میں ڈاکٹر احمد امین شکیب ارسلان اپنی تحریروں میں اسلامیات اور پختگی کی وجہ سے پسند آئے اور تخیلاتی ادب میں آپ سید عبد الرحمان کواکبی سے خاصے متاثر ہوئے، عالم عرب کے رسائل سے جہاں آپ کو ادبی ذوق کی چاشنی ملی وہیں پوری دنیا کے حالات سے آگہی بھی ہوئی جس کی وجہ سے نظر و فکر میں وسعت پیدا ہوئی اور ہندوستان کی محدود فضا سے نکل کر عالم اسلام اور اس کے مسائل و تحریکات میں دلچسپی کا سامان پیدا ہوا، تب آپ نے سیاسی تحریکات کا مطالعہ بھی شروع کیا، اس سلسلہ میں مولانا آزاد کے الہلال کے ولولہ انگیز مضامین، علامہ اقبال کی حیات بخش شاعری اور مولانا محمد علی جوہر کی پر جوش تقریروں کو سنا، بالخصوص اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں کی صف آرائیوں کو دیکھا تو آپ کے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا ہوا اور بعض خوابیدہ فطری صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔[vi]

سوانح نگاری:

ان حالات میں جب کہ ملک پر انگریز کا قبضہ تھا اور اسلام کے ایک پہلو (جہاد) کے خلاف جو ایک مخصوص لابی کام کر رہی تھی اس کی ضرورت تھی کہ اسلام کے اس پہلو کو اجاگر کیا جائے چنانچہ آپ کی سب سے پہلی تصنیف "سیرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ" ۱۹۳۹ھ میں اس وقت منظر عام پر آئی جب کہ آپ نے اپنی عمر کی صرف سولہ بہاریں دیکھی تھیں۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے تصنیفی سرمایہ کا جائزہ لیں تو اس کا قابلِ لحاظ حصہ سیر و سوانح کے موضوع پر نظر آتا ہے۔ ان کا سلسلۂ 'تاریخ دعوت و عزیمت' اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس میں امت کے مجدّدین و مصلحین کے احوال، دینی و علمی خدمات، تجدیدی کارناموں اور داستانِ عزیمت کو بڑے مؤثر اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ 'سیرت سید احمد شہیدؒ' ہندوستان کی تاریخ کے ایک عہد پر روشنی ڈالتی ہے اور سید شہیدؒ کے داعیانہ و مجاہدانہ کارناموں کا بھرپور انداز میں تعارف کراتی ہے۔[vii] ان کے علاوہ سیر و سوانح کے موضوع پر ان کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں، مثلاً صحبتے با اہلِ دل، حیاتِ عبد الحیؒ، مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت وغیرہ۔

ان کتابوں میں علی میاں نے متعلقہ شخصیات کا جامع تعارف کرایا ہے، ان کے خاندانی اور ذاتی احوال و کوائف بیان کیے ہیں، ان کی علمی و دینی، دعوتی و تبلیغی، اصلاحی و تجدیدی اور دیگر خدمات پر روشنی ڈالی ہے، معاشرہ پر ان کے کتنے اثرات مرتب ہوئے

؟اورامت کو ان سے کتنا فائدہ پہنچا؟اس کا تجزیہ کیا ہے۔ان تصانیف میں وہ ایک کام یاب اور ماہر سوانح نگار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔وہ کسی بھی موضوع کے تمام پہلوؤں کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔

حضرت ندوویؒ نے سوانح نگاری کے دوران عموماً متعلقہ شخصیات کی حیات اور خدمات کے ایجابی اور مثبت پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اور ان کی خامیوں، کوتاہیوں اور منفی پہلوؤں کو نظر انداز کیا ہے۔بعض حضرات نے اسے حضرت ندوویؒ کی سوانح نگاری کا ایک نقص قرار دیا ہے۔[viii] ان کا خیال ہے کہ سوانح نگار کو کسی شخصیت کا تجزیہ غیر جانب دار ہو کر کرنا چاہیے۔جس طرح وہ اس کی خوبیاں، کارنامے اور محاسن بیان کرے، اسی طرح اس کی ذمہ داری ہے کہ اگر اسے اس میں کوئی خامی اور منفی پہلو پائے تو اسے بھی نمایاں کرے۔

مگر اس میں مولانا صاحبؒ کی شخصیت کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ سید احمد بریلویؒ کی سیرت و سوانح پر سید ابوالحسن ندوویؒ نے اپنے تنقید نگاروں کی تنقید کو نا صرف تسلیم کیا بلکہ اس کی نئی اشاعت میں حسبِ ضرورت ترامیم کرتے رہے اور مولانا غلام رسول مہر صاحب کی تصنیف کی اشاعت کے بعد ان کی تحقیق سے بھرپور استفادہ حاصل کیا اور ان کی کتاب کی ترامیم سے بعد میں مولانا مہر نے اپنی تصنیف پر نظر ثانی کی۔[ix] حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی حیثیت اصلاً ایک داعیٔ اسلام اور مصلح کی ہے۔ان کی تمام تحریروں میں، جن میں سوانحی تحریریں بھی شامل ہیں، ان کی یہ حیثیت نمایاں ہے۔کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے انھوں نے اس کی خامیاں تلاش کرنے اور کم زوریاں نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اس کے مثبت پہلوؤں ہی کو اجاگر کیا ہے۔اس چیز کو مولانا نے اپنی 'افتادِ طبع' قرار دیا ہے۔"[x]

مولانا صاحب نے مختلف میادین میں اعلیٰ پائے کے عالمی اعزازات حاصل کئے ہیں.[xi]_[xii]

مولانا ندوویؒ علمی حلقوں میں علی میاں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ انکی حیات و خدمات پر تقریبا ۲۱ کتب لکھی جاچکی ہیں۔جن کی تفصیل انکے نام کے ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔[xiii]

تصانیف:

انھوں نے عربی اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جو کہ تاریخ، الہیات، سوانح ، ادب اور تنقید سمیت مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ سمیناروں میں پیش کردہ ہزاروں مضامین اور تقاریر بھی موجود ہیں۔

ابوالحسن علی ندوی المعروف علی میاںؒ[xiv] ایک بھارتی عالم دین ہیں ان کی مشہور کتاب انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ہے نیز مولانا صاحبؒ متعدد زبانوں میں پانچ سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔[xv] ذیل میں ان کی چند مشہور کتابوں کی فہرست درج ہے:

(۱) سیرت رسول اکرم ﷺ (۲) نبی رحمت ﷺ (۳) عالم عربی کا المیہ (۴) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر

(۵) المرتضیٰ (۶) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک (۷) دستور حیات (۸) بارہ (۱۲) دن ریاست میسور میں (۹) دعوت فکر و عمل (۱۰) حیات عبد الحیؒ (۱۱) کاروان مدینہ (۱۲) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ (۱۳) کاروان زندگی (۱۴) کاروان ایمان و عزیمت (۱۵) مدارس اسلامیہ (۱۶) مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں (۱۷) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی (۱۸) نقوش اقبالؒ

(۱۹) نئی دنیا امریکا میں صاف صاف باتیں (۲۰) قادیانیت تحلیل و تجزیہ (۲۱) پرانے چراغ (۲۲) پاجا سراغ زندگی (۲۳) قرآنی افادات (۲۴) سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ (۲۵) سیرت سید احمد شہیدؒ (۲۶) صحبتے با اہل دل (۲۷) شرق اوسط کی ڈائری (۲۸) طالبان علوم نبوت ﷺ کا مقام (۲۹) تاریخ دعوت و عزیمت (۳۰) علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں (۳۱) مقالات مفکر اسلام (۳۲) مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت (۳۳) اسمائے حسنی (۳۴) اسلامیات اور مغربی مستشرقین

علی میاںؒ کی ایک انتہائی مشہور عربی تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" ہے جس کے متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے، اردو میں اس کا ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے نام سے شائع ہوا۔ سید قطب شہیدؒ جو کہ اخوان المسلمون کے ایک رکن ہیں نے اس کتاب پر مقدمہ لکھا جس میں انہوں نے خصوصا علی میاںؒ کی استعمال کردہ اصطلاح جاہلیت کی تعریف کی جسے علی میاںؒ نے کسی عہد کے ساتھ مخصوص نہیں کیا بلکہ اسے مطلقا مادیت اور اخلاقی زوال کا استعارہ بتایا ہے۔ وہ بیک وقت مفکر، مدبر، مصلح، قائد، زمانہ شناس، ادیب اور نباض وقت خطیب تھے۔ اللہ نے انہیں فہم و فراست اور حکمت و بصیرت کے بڑے حصہ سے نوازا تھا۔ اس لئے دور حاضر کے تقاضے اور نفسیات کے مطابق وہ دین و شریعت پیش کرنے کا کام اپنے قلم اور زبان سے لیا کرتے تھے۔ دنیا کے جس گوشے میں جاتے وہاں دل کی گہرائیوں سے اسلام کا پیغام لوگوں کو سناتے۔ خاص طور سے عالم عرب اور اسلامی ملکوں میں لوگوں کو یاد دلاتے کہ تمہارے گھر سے دیئے گئے ایمان اور اسلام کے پیغام کی بدولت ہندوستان میں ہمارے آباؤ اجداد نے اپنے گھروں کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ اور آج جب باقی امت مسلمہ اسلام لانے کی قیمت کسی نہ کسی صورت ادا کر رہی ہے تو عرب محوِ خواب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت نے ہندوستانی مسلمانوں کا دفاع بھی اس طرح سے کیا کہ انھوں نے عرب ممالک کے اس پروپیگنڈہ کا بھی رد کیا کہ ہندوستان میں اب مسلمان نہیں رہے بلکہ جو تھے وہ سب پاکستان منتقل ہو گئے یا مار دیئے گئے۔ علاوہ ازیں انھوں نے عربوں میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو اپنی تحاریر و تقاریر کے ذریعے نہایت خوش اسلوبی سے متعارف کروایا۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

وہ اپنے عہد کے واحد ہندوستانی (عجمی) تھے جو عربوں کو ان کی زبان اور ان کے لہجہ میں بغیر کسی مرعوبیت کے مخاطب کرتے تھے، اور اس قدر فصیح عربی بولتے اور لکھتے تھے کہ اہل عرب خود اس کے قائل تھے۔ وہ اپنی تقاریر اور بیان سحر کے ذریعے جہاں تنقید واحتساب کی دعوت کے ساتھ طاقت وتوانائی کی راہیں ہموار کرتے اور دکھاتے وہیں ان کے دکھ اور درد میں شریک ہوتے ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے اور بارگاہِ الٰہی میں دعائیں بھی کرتے۔

مولاناصاحب نے جہاں عرب قومیت کا گمراہ کن نعرہ کی تردید کی وہیں انھوں نے فلسطین پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کی بھی بھرپور مذمت کی۔ اور وہ عربوں کو واضح الفاظ میں متنبہ کرکے فرماتے تھے کہ اسلامی صلاحیت اور دینی حمیت کا مطلوبہ معیار پورا کئے بغیر وہ قیادت کے مستحق نہیں ہوسکتے، عربوں کو جو بھی عزت نصیب ہوئی وہ اسلام اور محمد عربی ﷺ کا فیض ہے۔ یہ مایا اگر عربوں سے چھن جائے تو ان کے پاس کچھ باقی نہیں بچے گا۔[xvi]

ملت اسلامیہ میں عقابی روح کی بیداری

مولاناصاحب ایک ہمہ جہت شخصیت اور نجیب الطرفین سید تھے۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ عالم عرب مرکز ہے اور ان کا اپنے مرکز پر اسی طرح حق ہے جیسے کسی عربی عالم کا ہے۔ اسی لئے وہ علی الاعلان دعوی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"میرے تخیلات کی دنیا میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن، عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان و ادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے۔ عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت وبلندی کے لئے قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی عرب ادیب، مصنف اور مفکر سے کم نہیں۔"[xvii]

مولاناصاحب کی انہی تحریروں نے عرب میں ایک نئی روح بیدار کی۔ جس مسئلے پر مولاناصاحبؒ مسلسل لکھتے رہے تقاریر کرتے رہے وہ مسئلہ اگرچہ ہنوز موجود ہیں اور عالم عرب اور ان کے دانشوروں کو اس مسئلے کی طرف توجہ کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے فلسطین کے مسئلے کو عربوں کا نہیں اپنا مسئلہ سمجھا اور اس پر تقاریر کیں، کتب لکھیں، اسکے اسباب وعوامل بیان کئے اور حل کے لئے راہ دکھائی، وہ بارہا اپنی تحریر میں اس بات کا پرزور اعلان کرتے رہے کہ عربوں کے اس زوال وپستی کی بنیادی وجہ ان کے یقین کی کمزوری، شک وشبہ کا نفوذ اور احساسِ کمتری ہے۔

کویت اور سعودی عرب کی یہ تقریریں "عالم عربی کے المیہ کے نام سے اردو زبان میں شائع ہوچکی ہیں۔ ایک جگہ وہ عربی قومیت اور اشتراکی آمریت پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بات قبول کرلینی چاہئیے کہ عربی قومیت کی دعوت وتحریک کھلے طریقہ پر ناکام اور برسرعام رسوا ہوچکی ہے۔ ہم کو یہ بھی اعتراف کرلینا چاہئیے کہ ظلم کا انجام بہرحال برا ہے، اور جس راستہ کو عالم عربی کی آمرانہ اور اشتراکی حکومتوں نے اپنے لئے پسند کیا ہے وہ ملک ونسل دونوں کے لئے تباہ کن ہے، وہ نہ اسلام سے میل کھاتا ہے، نہ انسانیت سے، نہ حقیقی آزادی سے اسکا تعلق ہے، نہ جمہوریت ومساوات سے[xviii]

اسی طرح انھوں نے پاکستان کو بھی ملت اسلامیہ کا اہم جز سمجھتے ہوئے یہ ضرورت محسوس کی کہ وہ پاکستان پر اسلامی تہذیب کے تحفظ اور صحیح عقیدہ کی ضرورت کو واضح کریں، اور اس مملکت کے حکمرانوں کو اسلامی حکومت کے آداب و اطوار بھی سمجھانا اور سکھانا اپنا فرض سمجھا۔

تہذیب اسلامی کے اقدار کا تحفظ اور پرسنل لاء کا اطلاق

مولانا ندویؒ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس کی صدارت میں کئی خطبے دیئے اور ان میں مسلمانانِ ہند کے لئے جہاں پرسنل لاء کو لازمی بتایا وہیں اسے مسلمانوں کی عزت و آبرو کے لئے اہم قرار دیا۔ اور اس کی حفاظت کو اسلامی تہذیب و تشخص کے تحفظ سے تعبیر فرمایا۔

ان کے یہ خطبات و تقاریر مختلف عنوانات کے تحت کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے ایک اہم مجموعہ "پاجا سراغِ زندگی" ہے۔

انھوں نے اپنی تقریروں میں ندوۃ العلماء کے طلباء کو پیام دیتے ہوئے کہا کہ "شاخِ ملت انہی کے دم سے ہری ہو سکتی ہے۔"

امریکہ کے سفر پر گئے تو وہاں کی یونیورسٹیوں اور مجالس میں جو تقاریر کیں وہ "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں" اور "نئی دنیا" کے نام سے منظر عام پر موجود ہیں۔ جن میں حضرت نے دوٹوک انداز میں فرمایا کہ "امریکہ میں مشینوں کی بہار تو دیکھی، لیکن آدمیت اور روح کا زوال پایا" اسی وجہ سے انھوں نے اس کی اشد ضرورت محسوس کی کہ وہاں کے مسلمانوں کو تعلق باللہ، اور اپنے کام میں اخلاص اور انابت الی اللہ کی روح بیدار کرنے پر ابھاریں اور انھوں نے اپنا یہ پیغام ہر جگہ ہر ملک اور شہر میں دیا اور ایسے بخوبی سے اور ایمانی ولولے، قلبی درد اور داعیانہ انداز میں اس کا اعادہ کرتے کہ سننے والوں کے دلوں کو گرما جاتے۔

علاوہ ازیں یورپ، برطانیہ، سوئزرلینڈ اور اسپین کی یونیورسٹیوں اور علمی مجالس میں یہ پیغام دیا کہ وہاں کے مسلمان مغربی تہذیب و تمدن کے گرویدہ نہ ہو جائیں کیونکہ اس کا ظاہر روشن اور باطن تاریک ہے، مسلمان اس سرزمین پر اسلام کے داعی بن کر رہیں، انہیں اسلام کی ابدیت پر مکمل اعتماد رکھنا چاہئیے۔ اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نہر سوئز تعمیر کرنے کا کام کریں۔

مغرب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں وہ افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں۔ انفرادی زندگی اور قومی معاملات میں ان کا واضح تضاد نظر آتا ہے۔[xix]

حضرت نے امت کے مسائل کے حل کے لئے جو بھی بن پڑا اس سے دریغ نہیں کیا، انہوں نے ہر پلیٹ فارم پر مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے حقوق کی بازیابی کے لئے آواز بلند کی۔ چاہے وہ "مسلم پرسنل لاء بورڈ" ہو یا پیام انسانیت کا پلیٹ فارم بلکہ انہوں نے بالخصوص "پیام انسانیت" کے ذریعے امت کے ہر فرد کو ایک مہذب انسان اور ذمہ دار شہری بننے اور اپنے اندر وسعت نظری اور وسعت قلبی پیدا کرنے کا درس دیا اس کے ساتھ ہی اپنے مسلم برادران کو تلقین کی کہ وہ ہندوستان کو اپنا ملک سمجھیں، اور

اس کی تمام تہذیبوں اور مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ شرافت اور انسانیت کا سلوک قائم رکھیں۔ ان کے ساتھ مل جل کر رہیں، ان کا موقف تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی کشتی کا سوار ہیں۔ اور وہ اسی طرح تصور کر کے باہم معاملہ کریں۔ اس تحریک کا مسلمانوں کو یہ اچھا ثمرہ ملا کہ اکثریت کے حلقوں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم ہوئی اور ان کے مابین نفرت اور اختلاف کی فضا کو معدل بنانے میں مدد ملی۔

حضرت ندویؒ نے ہندوستان کی خوابیدہ امت مسلمہ کو جگانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ شہر شہر، بستی بستی اپنی تقریروں کے ذریعے یہ بتایا کہ دنیا پر خود غرضی اور بد اخلاقی کی دبیز چادر چھائی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کا فی الفور تدارک ممکن نہیں ہے لیکن انسانیت کا درد محسوس کر کے اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو ایکا کا نمونہ بنا کر اس صورت حال پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

حضرت کے مخاطبین عوام ہوں یا خواص، طلباء سے گفتگو ہو یا اہل علم سے دردمندانہ گذارشات، امراء وحکام کو نصیحت ہو یا دانشور موضوعِ سخن ہوں سب کو فقط پند ونصائح کے پیمانے میں رکھنے کے بجائے انہیں صاف اور واضح الفاظ میں آئینہ دکھانے پر وہ یقین رکھتے تھے اور سننے والے اس آئینے میں اپنی ہر طرح کی صورت اور سیرت کی کمزوریوں اور دل و دماغ کی کوتاہیوں کا مشاہدہ کرتے جاتے اور ساتھ میں اصلاح کرتے تھے۔

اور ترسیلِ پیغام کے اس بالواسطہ طریقے سے حضرت نے وہ کام لیا جو کہ فقط زورِ خطابت اور جوشِ بیان سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اسی وجہ سے عوام الناس سے لیکر اہل علم تک سب آپ کے گرویدہ تھے اور بے انتہا متاثر تھے۔ حضرت کی تحریروں اور تقاریر میں ایک انضباط نظر آتا ہے۔ جو دماغ سے زیادہ دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، قرآنی آیات و احادیث کی روشنی میں بزرگوں کی سیرت وسوانح کے حوالے سے حضرت جو فرماتے تھے وہ سامع کے دل میں اتر جاتا تھا۔[xx]

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھارت کے معروف علمی ادارہ "ندوۃ العلماء لکھنو" کے سربراہ تھے۔ اور ندوہ صرف ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک علمی و فکری تحریک کا نام ہے جس نے برصغیر پاک وہند و بنگلہ دیش پر برطانوی استعمار کے تسلط کے بعد ملت اسلامیہ کو بیدار رکھنے اور اس کے دینی و ثقافتی تشخص کی حفاظت کے لیے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اور ندوۃ العلماء جیسے ادراہ کہ جس کی بنیاد اگر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے رکھی تو مولانا شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسی عبقری شخصیتوں نے اسے پروان چڑھایا۔[xxi]

مولانا صاحب کا ندوہ سے تعلق:

ندوہ نے علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے درمیان توازن اور جامعیت کی ایک نئی راہ اپنائی اور اسلامی تاریخ کو ثقاہت و استناد کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھال کر نئی نسل کا رشتہ اپنے شاندار ماضی کے ساتھ استوار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے پاکستان چلے آنے کے بعد ندوہ کی سیادت سنبھالی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس فکر کا دائرہ برصغیر سے نکل کر پورے عالم اسلام تک پھیلتا چلا گیا۔ اردو تو مولانا ندویؒ کی گھر کی زبان تھی مگر عربی کو بھی ان سے کبھی اجنبیت کی شکایت نہ ہوئی۔ وہ عربی ایسی قدرت اور روانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے کہ خود عربوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے بعض عرب دانشوروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا خطاب اس لیے سنا کرتے تھے کہ ان کی زبان کی چاشنی اور سلاست وفصاحت کا حظ اٹھا سکیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ صرف ندوۃ العلماء کے سربراہ اور نمائندہ نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق جہاد بالاکوٹ کے عظیم جرنیل سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے بھی تھا۔

دعوتی سرگرمیوں کے امتیازی پہلو:

مولانا صاحب رحمۃ اللہ کی دعوت بنیادی طور پر تین نکات پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔

(۱) عام لوگوں میں ایمان کی عبادیات، عقائد و اعمال، معاملات واخلاق، تزکیہ نفس اور دعوت الی اللہ کو اس طرح رائج کیا جائے کہ ہر ایک میں اسلام کی حقیقت وحقانیت راسخ ہو جائے لیکن اس میں آپ انتہائی حد تک تدریج کے قائل تھے۔

(۲) رجال سازی کا کام: آپ سمجھتے تھے کہ کوئی بھی تحریک، ادارہ یا دعوت اپنی مالی قوت کے استحکام کے باوجود اس وقت تک روبہ ترقی نہیں ہو سکتی جب تک اس کو چلانے والے صحیح معنوں میں اس کے حامل اور وارث نہ ہوں کیونکہ جب پرانے افراد ختم ہو جاتے ہیں تب اگر نئے افراد نہ ہوں تو یہ تحریکیں اور دعوتیں ڈوب جایا کرتی ہیں، اس لئے اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے ہر دور میں نئے افراد پیدا کئے جاتے رہنے چاہئیں اور آپ اس پر خوب محنت فرماتے تھے۔

(۳) حوصلہ افزائی: اس سلسلہ میں کام کرنے والے افراد کی ہر لحہ حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو جذبات کے گل کے ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے حوصلہ افزائی کی جاتی رہنی چاہیے تاکہ بددلی اور کسر ہمت کا ان کے پاس سے گزر ہی نہ ہو۔

آپ کی تحریروں کا مرکز و مقصد

(۱) مسلمانوں اور بالخصوص عرب میں دینی و مذہبی شعور، ایمانی استقامت اور جذبہ عمل ابھارنا تاکہ ان کے عقائد و اعمال درست ہو جائیں۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی، عقلی اور جذباتی تعلق و جذبہ کو اس قدر مستحکم و مضبوط کرنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی عزیز تر ہو جائے۔

(۳) اسلام کے مفہوم کو جدید مغربی تصورات یا اقتصادی تعبیرات کی اصطلاحات کے تابع ہونے سے بچانے کی بھرپور کاوش اور اس میں تحریفات کی کوششوں کا مقابلہ کرنا۔

(۴) یورپین نظام تعلیم وتربیت (جو کہ آج کل اسلامی ممالک میں ایک وبا کی طرح کثرت سے پھیل رہا ہے) کے تسلط کا خاتمہ کر کے اسلام کا تعلیمی نظام نافذ کرنا۔

(۵) تمام ممالک اسلامیہ میں ایک ایسی علمی، عملی اور فکری منظم تحریک پیدا کرنا جس کی وجہ سے نئی تعلیم یافتہ نسل اسلام کے علمی ذخائر سے استفادہ کر سکے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی مقاصد بھی ذکر کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کا مقالہ "رکائز الفقہ الدعوی عند العلامہ ابی الحسن الندوی" قابل ذکر ہے اس میں انہوں نے آپ کی دعوتی فکر کو جن ۲۰ اساسی و بنیادی نکات پر مبنی قرار دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) مادیت کے مقابلہ میں ایمان راسخ (۲) عقل پر وحی کو برتری (۳) قرآن کریم سے گہری وابستگی (۴) سنت و سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ تعلق (۵) روحانیت کی چنگاریوں کو روشن کرنے کا جذبہ (۶) مثبت انداز فکر اور تعمیری کدوکش (۷) جہاد فی سبیل اللہ کا احیاء (۸) اسلامی تاریخ سے سبق آموزی اور عظماء اسلام کے کارناموں سے عبرت و جذبے کا حصول (۹) مغربی فکر اور مادہ پرستانہ تہذیب و تمدن پر تنقید (۱۰) جاہلی تعصب اور قوم پرستی کی تردید (۱۱) رد قادیانیت اور عقیدہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا تحفظ (۱۲) ذہنی ارتداد کا مقابلہ (۱۳) امت مسلمہ کے قائدانہ کردار کا تسلسل اور اس کی بازیابی کی جدوجہد (۱۴) صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی عظمت (۱۵) مسلہ فلسطین اور بیت المقدس کی بازیابی پر توجہ (۱۶) آزاد اسلامی تعلیم و تربیت کی ضرورت پر زور (۱۷) بچوں کی تربیت (۱۸) مبلغین اور مخلص کارکنوں کی تیاری کا جذبہ (۱۹) اسلامی بیداری اور اسلامی تحریکات کی متوازن رہنمائی اور رفع نزاع باہمی (۲۰) بوقت خطاب پوری انسانیت کو مخاطب کرنا۔

علاوہ ازیں قرضاویؒ اپنے ایک دوسرے مقالہ " فقہ الدعوۃ عند العلامۃ ابی الحسن" میں مولانا کی سات قابل رشک خصوصیات ذکر کیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) داعی دین کی صفات سے ان کا متصف ہونا (۲) مواقع کا حصول و استعمال (۳) عقل و حکمت سے سرفرازی (۴) وسعت مطالعہ اور کثرت معلومات (۵) ادبی صلاحیت اور بصیرت (۶) جیتے جاگتے دل کے ساتھ مرد مومن کے اخلاق و کردار (۷) صحیح اسلامی عقیدہ سے مزین شخصیت[xxii]

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تنقید نگاری کا اسلوب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تصنیفی سرمایہ کا جائزہ لیں تو اس کا قابلِ لحاظ حصہ سیر و سوانح کے موضوع پر نظر آتا ہے۔ ان کا سلسلۂ 'تاریخ دعوت و عزیمت' اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس میں امت کے مجدّدین و مصلحین کے احوال، دینی و علمی خدمات، تجدیدی کارناموں اور داستانِ عزیمت کو بڑے موثر اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ 'سیرت سید احمد شہیدؒ' ہندوستان کی تاریخ کے ایک عہد پر روشنی ڈالتی ہے اور سید شہیدؒ کے داعیانہ و مجاہدانہ کارناموں کا بھرپور انداز میں تعارف کراتی ہے۔ ان کے علاوہ سیر و سوانح کے موضوع پر مولانا کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں، مثلاً صحبتے با اہلِ دل، حیاتِ عبد الحیؒ، مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت وغیرہ۔

ان کتابوں میں مولانا نے متعلقہ شخصیات کا جامع تعارف کرایا ہے، ان کے خاندانی اور ذاتی احوال و کوائف بیان کیے ہیں، ان کی علمی و دینی، دعوتی و تبلیغی، اصلاحی و تجدیدی اور دیگر خدمات پر روشنی ڈالی ہے، معاشرہ پر ان کے کتنے اثرات مرتب ہوئے ؟ اور امت کو ان سے کتنا فائدہ پہنچا؟ اس کا تجزیہ کیا ہے۔ ان تصانیف میں مولانا ایک کامیاب اور ماہر سوانح نگار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع کے تمام پہلوؤں کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔

اہل مغرب کے افکار پر تنقید:

مولانا کا تنقیدی اسلوب ان کی جن کتابوں میں بہت نمایاں ہے، ان میں 'مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش' کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں وہ مغربی تہذیب کے زبردست ناقد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ترکی، مصر، ایران، تونس، الجزائر، لیبیا اور دیگر مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کے درمیان برپا ہونے والی کش مکش کا انھوں نے بھرپور تجزیہ کیا ہے اور جن مسلم شخصیات نے ان ممالک میں مغربی افکار و نظریات کو رواج دینے کی کوشش کی ہے اور اس معاملے میں اہم کردار انجام دیا ہے، ان پر زبردست تنقید کی ہے۔

مسلم امت پر مغربی تہذیب کے اثرات پر تنقید

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جن مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کے درمیان زبردست معرکہ برپا ہوا ان میں سرفہرست ترکی ہے۔ اس معرکہ میں مغربیت کا سپہ سالار کمال اتاترک تھا۔ اس نے ترکی سے اسلامیت کے تمام آثار کو ختم کرنے اور اس کو مغربی رنگ دینے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ مولانا نے نا صرف کمال اتاترک کی قیادت میں عروج پانے والی ترکی میں نا صرف لادینی (سیکولرازم) پر پرزور تنقید کی بلکہ قرونِ اولیٰ کی تقلید سے انحراف اور شدید مغربی تقلید اور عسکری آمریت کے عام شہری پر منفی اثرات کی بھی نشاندہی کی۔ اور پر اس نئی تہذیب کا پرزور انکار کیا کہ جس میں عربی زبان اور اسلامی اقدار سے پہلو تہی برتی رکھی گئی تھی۔ اور مسلم امت کو زبردستی مغربی سانچہ میں ڈھالا گیا تھا۔[xxiii]"

مولانا صاحب نے ان مسلم مفکرین کو کہ جنہوں نے مغربی تہذیب و معاشرت اور مغربی فکر و فلسفہ سے مرعوبیت کی بنا پر مغربیت کو فروغ دیا ہے، اور ان کی فکر کا تجزیہ کر کے اس کے تار و پود بکھیر دیے ہیں۔ مثلاً شیخ محمد عبدہ جدید مصر کی ایک مشہور شخصیت ہیں، جن کے معاشرہ پر گہرے اثرات مرتّب ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مغربی اقدار کا گہرا تاثر پایا جاتا ہے۔ جو کہ انکی تفسیر اور فتاویٰ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور مولانا صاحب نے ان کا موازنہ سرسید احمد خان سے کیا کہ جن کی تحریک کے وقتی اثرات میں سے ایک یہ تھا کہ نوجوانوں میں لادینی کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔[xxiv]

اسی طرح شیخ محمد عبدہؒ کے شاگرد قاسم امینؒ نے آزادئ نسواں کی تحریک چلائی اور اس موضوع پر موثر کتابیں تحریر کیں۔ اس کے نتیجے میں بے پردگی، مرد و زن کے اختلاط اور عورتوں کی آزادی کو بہت فروغ ملا۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب المراۃ الجدیدۃ میں چار مسائل سے بحث کی ہے: (۱) پردہ (۲) عورت کا عام زندگی میں حصہ لینا (۳) تعدّدِ ازدواج (۴) طلاق۔ ان چاروں مباحث میں انھوں نے اہلِ مغرب کے مسلک کو اختیار کیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہی اسلام کا مسلک ہے۔ ان کی کتابیں مصر کے جدید حلقہ میں بڑی مقبول ہوئیں، ان کی اشاعت اور آزادئ نسواں کی تحریک میں تجدّد پسندوں نے جو سرگرمی دکھائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں میں آزادی و بے پردگی کی ایک شدید لہر پیدا ہو گئی،[xxv]

جدید مصر کے ادباء اور دانش وروں میں ڈاکٹر طہ حسین کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے مصر کی نئی نسل کو مغرب زدہ بنانے میں اہم کردار انجام دیا ہے۔ مولانا نے اپنے تبصرہ میں دونوں پہلوؤں میں توازن برقرار رکھا

ہے۔ وہ جہاں طہ حسین کی ادبی خدمات کا برملا اعتراف کرتے ہیں،وہیں ان کی مغرب زدگی پر بھرپور نقد سے بھی گریز نہیں کرتے۔[xxvi]

مصر کے علمی و دینی حلقوں میں وہاں کے ازہری عالم اور جسٹس علی عبد الرازق کے ان خیالات سے بڑی بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا کہ اسلام نے نظامِ حکومت کے لیے کچھ اصول و نظریات نہیں دیے ہیں اور خلفائے راشدین نے سیکولر بنیادوں پر حکومت چلائی تھی۔ ان کے ان خیالات پر مصر میں زبردست بحث و مباحثہ ہوا اور ان کے رد میں متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ مولانا نے مصر میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش کے ضمن میں علی عبد الرازق کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے ان کی کتاب کے شائع ہونے کے بعد اس کے مصنف اور عالم اسلام پر منفی اثرات پر سیر حاصل بحث کی۔[xxvii]

خلاف شریعت اقدامات پر تنقید:

مولانا نے تونس کے پہلے صدر 'حبیب بورقیبہ' کے خلافِ شریعت اقدامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور قرآن اور رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ان کے گم راہ کن خیالات نقل کرتے ہوئے ان پر تنقید کی ہے۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ:

کلمۃ الحق عند سلطان جائر[xxviii] وہ فرماتے ہیں کہ صدر بورقیبہ ناتو کوئی قابل ذکر علمی مقام رکھتے ہیں اور ناہی ان کے خیالات کے پیچھے کوئی فکر و مطالعہ ہے۔ بلکہ وہ احساسِ کمتری اور ذہنی غلامی کا شکار ہیں بلکہ وہ بسوال کرتے ہیں کہ جو شخص اس قسم کے اسلام دشمن خیالات رکھتا ہے، وہ دائرۂ اسلام میں بھی باقی رہ سکتا ہے یا نہیں ؟ اور کیا اسے ایک اسلامی اکثریت کے ملک پر حکم رانی کا حق حاصل ہے ؟"[xxix]

مولانا نے ہندوستان کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہاں مغربی کلچر کے فروغ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے۔ اس ضمن میں انھوں نے سر سید احمد خاں کی شخصیت اور افکار پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا تجزیہ کیا ہے۔ اور سر سید کے انگریزی تہذیب سے غیر معمولی مرعوبیت کی طرف نشاندہی کی۔[xxx]

مغربی تہذیب و معاشرت سے سر سید کی تاثر پذیری کے حوالے سے مولنا صاحب نے ان کے افکار کے مسلم سوسائٹی پر اثرات اور ان کے دعوت کے غلط رخ کی نشاندہی کہ ان کا نقطۂ نظر خالص مادی ہو گیا تھا اور وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے۔ وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے۔ انھوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان و لغت کے مسلّمہ اصول و قواعد اور اجماع و تواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا۔ چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی و علمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کر دی۔[xxxi]

برصغیر پاک وہند میں مختلف مکاتبِ فکر اور جماعتوں ط پر نقد اور طرزِ استدلال:

مولانا صاحب نے اپنے دعوت کے اصولوں کے پیش نظر ان تمام اختلافی نظریات اور دینی مذہبی اور فرقہ وارانہ پنپنے والے عقائد اور تحریکوں کے منفی اثرات کا نہایت مثبت انداز میں رد پیش کیا۔ جن میں اہل سنت والجماعت میں نئی تحریک جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت ہیں علاوہ ازیں اہل سنت اور شیعہ کے عقائد کا تقابلی جائزہ، اور فتنہ قادیانیت کا رد وغیرہ شامل ہیں۔

ہم یہاں ان کے تنقید کا اسلوب بیان کریں گے کہ کس احسن طریقے سے انھوں نے صرف افکار یا عقائد کا رد کیا بغیر کسی ذات پر رد کئے ہوئے۔

برصغیر کی تحریکات پر نظر اور ان کی اصلاحی تنقید:

بیسویں صدی میں اٹھنے والی انقلابی تحریکیں امت میں ایک نئی روایت کا آغاز تھیں۔ ان سے امت کی اصلاح و تجدید کا یہی نکتہ پوشیدہ رہ گیا۔ بطور خاص برصغیر میں دین کی تعبیر کے لیے جو اسلوب اختیار کیا گیا، جو لب ولہجہ اپنایا گیا، وہ یہاں کے لیے ایک نئی اور نامانوس بات تھی۔ اس کے باعث، نیز یہاں کے مخصوص حالات کے پیش نظر علما کی بڑی تعداد اس تحریک سے دور و نفور ہی رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص فکری حلقہ پیدا کرنے کے علاوہ یہ تحریکیں کوئی ہمہ گیر شکل اختیار نہ کر سکیں۔ عوام قابل ذکر تعداد میں ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔

البتہ برصغیر کی بعض دوسری اور تحریکوں میں بھی افراط و تفریط کی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ ان میں سے بعض مغربی انقلاب سے شدید طور پر متاثر تھیں اور بعض خالص صوفیانہ نقشہ کے ساتھ اصلاح کا کام کرنا چاہتی تھیں۔ مسلم لیگ تحریک زوروں پر تھی جمیعت علماء سے اختلاف کی بنیاد پر علماء کرام ان کا مرکز ہدف تھے اور خاکسار تحریک نے اس کو اور ہوا دی۔ انھوں نے علمی انداز میں اس تحریک کا محاسبہ کیا کہ یہ متبع شریعت ہے یا نہیں۔[xxxii]

تحریکی و انقلابی تصور دین کی علمبر دار جماعتوں اور تحریکوں نے بلاشبہ دین کی مدافعت و نصرت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کئی نسلوں کو الحاد و تشکیک کے حملوں سے بچایا، اسلام سے متعلق مختلف پہلوؤں پر عصری اسلوب و آہنگ میں لٹریچر فراہم کیا۔ مستشرقین اور متجددین کے اعتراضات کے جواب دیے۔

مذکورہ تحریکات کی نشو ونما اور ارتقاء کا زمانہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عنفوان شباب کا زمانہ ہے۔ مولانا نے ان میں سے بیشتر تحریکات اور ان کے بانیوں کو دیکھا، پرکھا اور برتا تھا۔ کئی ایک سے ان کی عملی وابستگی بھی رہی اپنے فکری سفر کے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بالآخر وہ خود "ایک شخص ایک کاروان" کی شکل اختیار کر گئے۔ گزشتہ نصف صدی کی عظیم علمی و فکری شخصیات کے مابین مولانا تنہا ایک ایسے داعی و مفکر اور روحانی قائد اور مرشد امت ہیں جو ان ساری محدودیتوں سے نکل کر بذات خود ایک مدرسہ فکر کی حیثیت اختیار کر گئے۔

مولانا صاحب کا مختصر اتعارف یہی ہو سکتا ہے کہ ان کا فکری خمیر تحریک شہیدین کی جامع روح پرور اور انقلابی و تجدیدی دعوت سے اٹھا تھا۔ یہی تحریک تھی جو ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے

بعد وہ اسی تحریک کو مثالی اور آئیڈیل نمونہ تصور کرتے تھے، اور اسی کے عملی مظاہر اور تقاضوں کی تلاش و جستجو میں انھوں نے مختلف شخصیات اور مختلف مراکز دعوت و فکر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ سید مودودیؒ سے ان کا فکری رشتہ اسی کی خاطر استوار ہوا تھا۔

اسی لئے جہاں بستی نظام الدین کے مرکز تبلیغ کی طرف ان کے قدم تبلیغی تحریک کے وسیع تناظر کو دیکھتے ہوئے ہی اٹھے تھے مگر وہ سمجھتے تھے کہ گذرتے وقت کے ساتھ یہ تحریک اپنے اس مقصد کی طرف گامزن نہ ہو سکی جس طرح کہ بانی تبلیغ اور مصلح امت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے ذہن نے سوچا تھا اور اس تحریک کے اگرچہ دوررس ثمرات ابھی بھی تمام عالم میں موجود ہیں مگر اصل مقاصد مولانا صاحب کے ذہن میں ہی رہے اور ان کی وفات پر ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔ اور اس کا انھوں نے اپنی کتب میں برملا اظہار کیا۔

اسی طرح عالم عربی کے مجدد امام حسن البناءؒ کی تحریک اور ان کا منہج عمل اپنے جلال و جمال میں اسی تحریک کا پرتو نظر آیا اور مولانا نے اس سے فیض اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ غرض یہ کہ ان کا اصل مایہ خمیر تحریک شہیدین تھی، اسی مشن کو انھوں نے اپنا مشن بنایا اور تاحیات اس مشن کے وفادار رہے، اور خود ان کا وجود مسعود بھی اس تحریک کا معنوی و عملی امتداد و تسلسل کا مظہر بن گیا۔

مولانا صاحبؒ کا بنیادی وصف یہ تھا کہ وہ عالم اسلام میں منصب توجیہ و ترشید پر فائز تھے۔ عصر حاضر میں دین کی نئی تعبیر و تشریح کا مسئلہ پیش آیا اور بعض مفکرین سے اس سلسلہ میں بعض تسامحات ہونے لگے تو مولانا نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اس ضمن میں اپنے بعض محبوب رفقاء اور دوستوں پر بھی علمی تنقید و محاسبہ کا فرض انجام دیا اور عصر حاضر میں دین کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں مولانا مودودیؒ کی تعبیری فروگزاشتوں کا بھی مؤاخذہ کیا۔ "**اریدان اتحدث الی الاخوان**" اور کتاب "**البصائر**"، "**عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح**" اور "**ترشید الصحوۃ الاسلامیۃ**" سب اسی توجیہی و ترشیدی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جب برصغیر کے ایک تحریکی حلقہ میں یہ مسئلہ بڑے شد و مد کے ساتھ اٹھایا گیا کہ قرآن کے مخصوص مصطلحات کے معنی و مفہوم پر صدیوں پردہ پڑا رہ گیا تھا تو مولانا نے اس بات کی شدت کے ساتھ تردید کی اور علمی اور مثبت انداز میں "**دعوت و عزیمت**" کا ایک تاریخی سلسلہ لکھا۔

اور یہ سلسلہ اصلاً ان کے اس دعوے کا علمی ثبوت تھا کہ امت میں اصلاح و تجدید کا ایک تاریخی تسلسل قائم رہا ہے اور کسی مرحلہ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ دین کے مجموعی مفاہیم امت سے مستور ہو گئے ہوں۔ **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین** اور "**الصراع بین الفکرۃ الغربیۃ والفکرۃ الاسلامیۃ**" میں انھوں نے مختلف اسلامی ممالک میں امت کے ماضی حال و مستقبل کا ایک بصیرت افروز اور مؤثر خانہ وناقدانہ جائزہ لیا، زوال و ادبار کے عوامل کی نشاندہی بھی کی اور موجودہ حالات میں عالم اسلام کس راستہ کو اختیار کرے، اس سوال کا جواب دیا اور واضح منہج عمل مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ اور حقیقتاً عالم اسلام نے مولانا کی اس توجیہ و ترشید کو دل سے قبول کیا ہے، اس لحاظ سے مولانا اس صدی کے بہت بڑے فکری قائد اور روحانی مرشد ہیں۔

غیر اسلامی فتنوں کا تحریری سدباب

مولانا کے تنقیدی اسلوب کی ایک نمائندہ کتاب 'قادیانیت۔ مطالعہ و جائزہ' ہے۔اس میں انھوں نے فتنۂ قادیانیت کا بھر پور جائزہ لیاہے اور اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش قرار دیاہے۔ردِّ قادیانیت پر وسیع لٹریچر موجود ہے۔اس میں بہت سی ایسی کتابیں ہیں جو مجادلانہ اور مناظرانہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں اور ان میں قادیانیت کے بانی مرزاغلام احمد کے بارے میں سخت زبان استعمال کی گئی ہے۔ لیکن مولانا کا اسلوب اس حسّاس اور نازک موضوع میں بہت محتاط رہاہے۔ انھوں نے مرزاغلام احمد اور ان کی تحریک کے بارے میں بہت شائستہ زبان استعمال کی ہے اوراس طرزِ تخاطب سے مکمل احتراز کیاہے جو اس زمانے میں رائج تھا۔[xxxiii]'

مولانانے اپنی کتاب میں مرزاغلام احمد کا جہاں بھی نام لیاہے وہاں ان کے نام کے ساتھ 'صاحب' ضرور لگایاہے۔کتاب میں مولانانے مرزاقادیانی اور ان کے خلیفۂ اوّل حکیم نور الدین کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں،ان کے خیالات وافکار کا تجزیہ کیاہے اور ان کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیاہے۔ ہر جگہ پوری متانت اور شائستگی کو ملحوظ رکھاہے۔ مولانا کو شکایت ہے کہ مرزاقادیانی نے جو اسلوب اختیار کیاہے وہ پیغمبروں اور مصلحین و مجددین توکجا،باوقار اور سنجیدہ مصنفین کے اسلوب سے بھی ادنیٰ مناسبت نہیں رکھتا۔[xxxiv]

مولاناصاحب کے اس طرزِ تنقید کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مولانانے قادیانیت پر تنقید کرنے میں کوئی نرمی دکھائی ہو یا مداہنت سے کام لیاہو۔وہ صاف الفاظ میں قادیانیت کو اسلام کے متوازی ایک مذہب اور نبوت محمدی کے خلاف سازش قرادیتے ہیں۔[xxxv]'

اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھیں ان میں قادیانیت کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ وہ تحریکیں یاتو اسلام کے نظامِ حکومت کے خلاف تھیں یاشریعت اسلامی کے خلاف، لیکن مولانا کے بقول قادیانیت درحقیقت نبوت محمدی ﷺ کے خلاف ایک سازش ہے۔وہ اسلام کی ابدیت اور امت کی وحدت کو چیلنج ہے۔[xxxvi]"

اہل سنت اور شیعہ فرقہ کے عقائد کا تقابلی جائزہ

مولانا کی ایک تصنیف 'دینِ اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں' کے نام سے ہے۔ اس میں اہل سنت اور شیعی فرقہ اثناعشریہ کے بعض عقائد کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیاہے۔ اہل سنت کی طرف سے ردِّشیعیت پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بیش تر پر مناظرانہ و مجادلانہ رنگ غالب ہے۔ لیکن اس کتاب کا رنگ ہی دوسرا ہے۔اس میں صدرِ اسلام کی دو تصویریں الگ الگ پیش کی گئی ہیں۔ ایک تصویر وہ ہے جو اہل سنت کی کتابوں سے سامنے آتی ہے۔یہ بڑی تاب ناک اور روشن تصویر ہے۔ دوسری تصویر تاریک تر اور بھیانک ہے۔یہ شیعی نقطۂ نظر کی حامل کتابوں سے سامنے آتی ہے۔ مولانانے پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ دونوں تصویریں پہلو بہ پہلو قارئین کے سامنے رکھ دی ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا۔[xxxvii]'

حضرت ندویؒ کی شخصیت نا صرف دانائی و دور اندیشی سے عبارت تھی بلکہ حق پرستی و جرات کا بھی اعلیٰ مظہر تھی،انھوں نے حق گوئی سے گریز کرکے تلخ حقائق کے اظہار پر مصلحت اندیشی کا غلاف کبھی نہیں چڑھایابلکہ باطل کے خلاف ہمیشہ کھل کر آواز

بلند کی۔ انھوں نے ایران کے دورے کے موقع پر شیعہ اور سنیوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا مشورہ دیتے ہوئے ان کے اختلافات کو ختم کرنے پر زور دیا۔ اور اسی طرح جب وہ افغانستان تشریف لے گئے تو انھوں نے جہاں مستشرقین کے افکار و نظریات سے اپنا دامن بچانے کی تلقین کی وہیں اس بات کی ضرورت محسوس کی مغربی ثقافت کی یلغار سے حتی الامکان بچنے کی وصیت کی۔

علاوہ ازیں انھوں نے ہندوستان و پاکستان میں شیعہ و سنی کے مسلکی اختلافات کو امت کے لئے ایک "رستا ہوا ناسور" کے نام سے تعبیر کیا اور اس کے تدارک میں فکر مند اور پیش پیش رہے۔

جدید تحریکوں کے افکار کا ناقدانہ جائزہ:

مولانا کے تنقیدی اسلوب کی نمائندہ ایک مہتم بالشان کتاب 'عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح' ہے۔ یہ کتاب مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے بعض افکار کے رد میں لکھی گئی ہے۔ برِّ صغیر ہند و پاک میں بعض مخصوص اسباب سے مولانا مودودیؒ کے بعض افکار و نظریات کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بڑی تعداد ایسی کتابوں کی ہے جن میں مولانا مودودی کو ضالّ و مضلّ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے افکار کو 'فتنۂ مودودیت' سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کے رد میں بعض مدارس اور اداروں میں سیکشن مخصوص کیے گئے ہیں۔ وہ متانت و شائستگی کے اعلیٰ مقام پر نظر آتے ہیں اور دل میں ان کی عظمت کا گہرا نقش قائم ہوتا ہے۔

مولانا مودودیؒ (وفات ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ئ) کی حیات کے آخری دنوں میں یہ کتاب ان تک پہنچی تو اس پر انھوں نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بلکہ شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے مولانا ندویؒ سے اپنی دیگر کتابوں اور تحریروں کا بھی تجزیہ کرنے کی درخواست کی۔ اس کا تذکرہ مولانا ندویؒ نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے۔

علاوہ ازیں وہ ترجمان القرآن' (حیدر آباد) میں شائع ہونے والے ان مضامین کے اسلوب پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ ان مضامین نے تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں کو متوجہ کر لیا، جو مغربی تہذیب اور فلسفۂ حیات کی تردید و تنقید میں 'مدافعانہ' کے بجائے 'جارحانہ' انداز میں لکھے گئے تھے، نیز مغربی تعلیم کے اثر سے پیدا ہونے والی تجدّد کی تحریک اور ان خیالات کی تردید میں، جو غالی قوم پرستی کی شکل میں پیدا ہو گئے تھے، تحریر کیے گیے تھے۔ مگر وہ یہاں اس کے مثبت اثرات کے منتج ہونے کے بھی متمنی ہیں۔[xxxviii]"

مولانا نے مودودی صاحبؒ کے اسلوب بیاں اور طرز تحریر پر بھی بحث کی کہ اس کتاب میں نہ تو مناظرانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے نہ فتویٰ کی زبان استعمال کی گئی ہے۔[xxxix]

مولانا ندویؒ نے مولانا مودودیؒ سے جن مباحث میں اختلاف کیا ہے ان میں پورے دلائل کے ساتھ اپنی بات رکھی ہے، لیکن کہیں بھی اسلوب کی متانت پر حرف نہیں آیا ہے اور شائستگی مجروح نہیں ہوئی ہے۔ پوری کتاب میں طنز و تعریض کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ آخر میں مولانا نے پھر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کی علمی تاریخ میں اختلافِ آراء کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ اسے کبھی ناپسندیدہ نہیں سمجھا گیا، بلکہ مفید سمجھا گیا ہے۔[xl]

یہ بات صحیح ہے کہ مولانا نے اپنی سوانحی تحریروں میں عموماً ایجابی رویّہ اختیار کیا ہے اور مثبت پہلوؤں کو پیش کیا ہے، لیکن اہم دینی تقاضوں کے پیش نظر جب کبھی انھیں بعض شخصیات پر تنقید کرنی پڑی ہے تو انھوں نے متانت اور شائستگی کا پورا خیال رکھا ہے اور مجادلانہ و مناظرانہ انداز سے قطعی پرہیز کیا ہے۔ یہ مولانا کی شخصیت کا ایسا قابل تقلید پہلو ہے، جسے موجودہ دور میں اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نثری بیانیہ

مولانا صاحب ایک درہ یکتا تھے، گوہر نایاب، جس نے سمرقند و بخارا، دمشق و بغدار، اسکندریہ و قاہرہ، شیراز و اصفہان کی مٹی سے جنم نہیں لیا تھا بلکہ ہندوستان کی مٹی سے جنم لیا جس کے سپوتوں نے عرب کی مقدس سرزمین میں جنم لینے والے دانشوروں کی بھی فکری قیادت کی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کی ایک تابندہ مثال تھے۔ وہ پوری دنیا میں ہند کی تہذیبی، لسانی اور ثقافتی، شناخت کا کا ایک نمایاں حوالہ تھے۔ رب ذوالجلال نے انہیں قلب متقلب، مع الحق اور لسان متحلی بالصدق ودیعت فرمایا تھا، اس لئے وہ ہمیشہ سچے الفاظ لکھتے رہے اور دعوت دیتے رہے۔ ان کی کسی بھی تحریر یا تقریر میں مداہنت کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ ان کی ہر ایک کتاب امت کے لئے بیش قیمت تحفہ ہے کہ جن مسائل کی طرف انھوں نے نشاندہی کی نا صرف پوری امت مسلمہ بلکہ عرب ابھی تک مغربی نظام اور تہذیب کی قید میں جکڑا ہوا ہے۔

"تاریخ دعوت و عزیمت" اپنی نوعیت کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جسے لکھنے کیلئے صدیوں کی ریاضت چاہئے۔ مگر مولانا نے اس طرح کی بہت سی کتابیں لکھیں اور ان کتابوں نے بہتوں کی ذہنی دنیا کو بدل ڈالا۔ "سیرت احمد شہید"، ہو یا "المرتضی"۔ ان کی کتاب "پاجا سراغ زندگی" ہو یا "کاروان زندگی" یہ ایسی کتابیں ہیں جنہیں وقت کی سختی کبھی نہیں مٹا سکتیں۔

علی میاں، عربی زبان و ادب کے صاحب طرز ادیب تھے اور ان کی عظمت کا نقش عرب کے بڑے بڑے فضحا و بلغا کے ذہنوں پر قائم ہے۔ سید قطب ہوں یا انور الجندی، علی طنطاوی ہوں یا یوسف القرضاوی، شکیب ارسلان ہوں یا ناصر الدین البانی، شکری فیصل ہوں یا شیخ عبد العزیز رفاعی، سبھی علی میاں کی فصاحت و بلاغت لسانی کے اسیر ہیں۔

مولانا علی میاں نا صرف اردو بلکہ عربی کے بھی ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ انکی عربی دانی اور گرامر کی ابتدائی کتب کا سلسلہ درسِ نظامی کا حصہ ہے۔ وہ کون سی صنف ہے جس میں مولانا ابو الحسن ندوی نے اشہب قلم نہ دوڑائے ہونگے، اور کونسا ایسا موضوع ہے جسے ان کا قلم چھو کر نہ گزرا۔ انہوں نے سیرت پر لکھا تو پڑھنے والا خود کو اسی دور میں گم ہو جاتا ہے۔ سوانح لکھی تو یوں کہ بعد کے سوانح نگاروں نے اپنی تصحیح کی۔ م ک ۹ سفر نامے لکھے تو ایسے کہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کی یاد تازہ ہو جائے اور خاکے لکھے تو ایسے کہ کیا کوئی اردو کا سقراط اور بقراط لکھے گا اور خود نوشت لکھی تو ایسی کہ پڑھنے والے کے دل میں ویسی ہی زندگی جینے کی تمنا جاگ اٹھی۔

مولانا علی میاں، نام نہاد ماہرین اقبالیات سے کہیں زیادہ بڑے اقبال شناس تھے۔ اقبالیات کے ضمن میں ان کا جو کارنامہ ہے وہ لازوال ہے۔ اقبال کے افکار کی تفہیم صحیح معنوں میں وہی کر سکتا ہے جس کے ذہن کی جڑوں میں اسلامی فکری روایت بھی شامل ہو۔ جو اسلام کے متحرک، انقلابی عناصر کو سمجھتا ہو، اقبال کی فکری شخصیت کو مولانا نے ہی صحیح تناظر میں سمجھا اور عرب دنیا کے سامنے ان کے افکار اس طرح پیش کئے کہ عالم عرب بھی علامہ اقبال کا والہ وشیدا ہو گیا، پھر عبد الوہاب عزام اور صاوی علی شعلان نے اقبال شناسی کے دائرے کو اتنی وسعت بخشی کہ عرب کی فضا اقبال کے نغموں سے گونجنے لگی۔ اور صحیح معنوں میں نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر اقبال کے مسجد قرطبہ کی گونجتی رہی۔

دراصل اقبال کے شاہین یعنی انقلاب و تحریک کے استعارہ کو مولانا نے ہی اس کی مکمل معنویت کے ساتھ سمجھا اور اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ ان کی ہر تصنیف میں یہ شاہین زیریں سطح پر ضرور موجود ہوتا ہے۔ "نقوش اقبال" ان کی ایک ایسی کتاب ہے جو اقبالیات پر محض ایک اضافہ نہیں بلکہ اقبال شناسی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کے جملہ افکار کا حق انھوں نے ادا کیا۔[xli]

علامہ اقبال کی طرح مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی بھی مغربی طوفان کیلئے ایک چٹان کی مانند تھے۔ مولانا کی شخصیت میں مشرقی تہذیب، ثقافت اور علوم کی جڑیں بہت مضبوط تھیں اور انہیں مشرقی تہذیب و ثقافت کی رفعت اور عظمت پر اتنا یقین تھا کہ مغرب کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ مغربیت اور مادیت پرستی کے خلاف مولانا نے نا صرف قلمی بلکہ عملی جہاد بھی شروع کر دیا تھا۔ مولانا جانتے تھے کہ مغربی تہذیب کی یلغار، مشرق کے فکری ایوانوں کو تہس نہس کر دے گی، اس لئے انہوں نے مکمل مزاحمت اور مقاومت کے ساتھ مغربی تہذیب کے خلاف لکھا اور عالم عرب کو بھی اس تہذیب کے دلدل سے نکالنے کی کوشش کی۔

مولانا کا ادبی ذوق انتہائی شستہ اور شائستہ تھا۔ ادب کا باضابطہ مطالعہ ان کے روزہ مرہ کے معمول میں شامل تھا۔ ان کی تحریروں میں میر، غالب، مومن، فیض، جگر کے اشعار چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا کے اظہار و بیان کی جمالیات میں دراصل بہت کچھ حصہ عالمی ادبیات سے آشنائی کا بھی ہے۔ ان کے الفاظ میں شوکت و جلال اور رعنائی و جمال کا بہت ہی خوبصورت وصال نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر صرف جادو نہیں جگاتی بلکہ ذہنوں کے بند در یچوں کو بھی وا کرتی ہے۔ ان کی تحریر میں فکشن کے سارے تشکیلی و ترکیبی عناصر موجود ہیں۔ اگر انہیں اردو کا ایک بڑا 'فکشن رائٹر' کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ ان کے باطن میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار چھپا بیٹھا تھا اور وہ اپنی ہر تحریر میں بڑی خوبصورت منظر نگاری کرتے تھے۔ ماضی کے واقعات کی بعینہ ایسی تصویر کھینچتے تھے جیسے وہ خود اس واقعہ کے چشم دید گواہ رہے ہوں۔ قصص النبیین کی کتب کا سلسلہ ان کے طرزِ بیان کی سند ہے۔ کہ نا صرف ان کی کتب چاہے وہ اردو کی ہوں یا عربی کی، سے زبان کے معروف ضرب الامثال اور محاورات سے آشنائی ہوتی ہے بلکہ قاری لغت کے لحاظ سے مفردات اور ان کے استعمال سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔

مولانا کی ہر تحریر گویارات کے اندھیروں میں سورج کی طرح چمکتی ہے اور دن کے اجالوں میں شجر سایہ دار بن جاتی ہے۔ یاایسی آگ اور ایسی روشنی بہت کم مذہبی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ان کی تحریر ہر مومن کے قلب میں قندیل روشن کرتی ہے، گو کہ ان کے اسلوب تحریر

میں الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے کبھی محسوس ہوتا ہے کہ بے جا طوالت ہے مگر ہو سکتا ہے کہ "ایضاح المطالب" کیلئے ہی انہوں نے ایسے اسلوب کو اختیار کیا ہو گا۔ااور اصلاحی اور دعوتی مشن کیلئے یہی اسلوب موزوں ہے، البتہ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ان کے بیان میں بلاغت، سلاست اور فصاحت سے علوم و معارف کا دریا بھی موجزن رہتا ہے۔

فقہی توسع میں تفردات کا وصف

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا دوسرا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ فقہی توسع کے قائل اور اس کے علمبر دار تھے۔ انھوں نے جمود و تقلید کے بجائے ہمیشہ اجتہاد کی دعوت دی۔ جس کی وجہ اکثر اہل علم انکے حنفی مسلک پر قدغن لگاتے تھے۔ عشق رسول ﷺ، اتباع سنت، اور احترام سلف کے ساتھ ساتھ تربیت باطن اور تزکیہ واحسان کو شرعی تقاضا قرار دیتے رہے۔ انھوں نے تصوف کو بدعات و خرافات اور عجمی اثرات سے پاک کرنے کی دعوت دی اور کتاب وسنت پر مبنی تصوف (احسان) کو روح دین سے کبھی متصادم نہیں سمجھا بلکہ اگر دیکھا جائے تو صحیح معنی میں انھوں نے ہی برصغیر میں پہلی بار علم تزکیہ (تصوف) کی تجدید کی اور اسے بدعات و شرکیہ اعمال سے تطہیر کی اور اسی سلسلہ میں ان کے گہربار قلم سے "ربانیۃ لارھبانیۃ" نکلی۔

ان کا مقصد اور منبع اصل میں پوری ملت اسلامیہ تھی تو انھوں نے پوری ملت کو اپنا مخاطب سمجھا اور بنایا چنانچہ انہیں جماعت دیوبند سے بھی ویسی ہی محبت تھی جیسی تحریک ندوہ سے۔ محدثین کے مسلک سے بھی انھیں عقیدت تھی اور متبع سنت صوفیا اور سلاسل تصوف کے بھی وہ قدر دان تھے۔ جہاں وہ برصغیر کو اپنا موضوع سخن بناتے تھے وہیں عرب ان کا اہم موضوعِ تحقیق و بحث رہا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا کے اس فکری اور عملی توسع کی وجہ سے جہاں وہ اپنے معاصر مفکرین کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں وہیں ان کے موضوعِ سخن میں تنوع کی وجہ سے ان کی رائے یا موضوع پر گرفت کہیں سطحی نوعیت کا ہے اور کہیں مضبوط۔

دین کی سیاسی تعبیر پر تنقید

مولانا ندویؒ نے دین کی سیاسی تعبیر پر تنقید کی، تاہم وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی دین وسیاست کی دوئی اور تفریق کے قائل نہیں رہے۔ ان کا سلسلہ ''اسمیات''' اس پر شاہد عدل ہے کہ انھوں نے اسلام کی شوکت، خلافت کے ادارہ کے احیا اور عالم اسلام کے اتحاد اور قوت کی آرزو کی، اس کے لیے کوششیں کیں اور عالم اسلام کے سربراہوں، امرا، مفکروں اور دانشوروں سے جماعتوں اور ان کے قائدین کو اس سلسلہ میں واضح نکات پیش کئے۔ انھوں نے عالم اسلام کے مسائل سے ہمیشہ تعلق رکھا، مسلمان امرا کو ان کے فرائض سے متعلق آگاہ کرتے رہے، چونکہ ان کا نقطہ نظر پوری امت مسلمہ تھی تو انھوں نے جہاں ترکی کی کمالیت پر

تنقید کی، وہیں مصر کی ناصریت، اور عربی قومیت و تعصبیت کی بھی نشاندہی کی اور مسجد اقصیٰ اور مقبوضہ فلسطین کے مسائل کو پوری امت کا مسئلہ قرار دیا۔

لیکن ان کا یہ درد محض احساس و شعور اور قرطاس و قلم تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ میدان عمل میں آکر ایک دیدہ ور سپاہی کی طرح اور ایک باشعور اور بابصیرت قائد کی طرح ہر محاذ پر آگے نظر آئے ان کی پوری زندگی تمام تر علمی و تحقیقی مشغولیتوں، عبادات کے ذوق و شوق اور روحانی ریاضتوں کے باوجود سر تاپا جہد و عمل سے عبارت تھی۔ وہ عالم اسلام میں ہونے والے ہر قسم کے تعلیمی و تربیتی، دعوتی اور اصلاحی کاموں میں تعاون کرتے اور اصلاحی تحریکات کے پشت پناہ اور مؤید تھے۔[xlii]

حوالہ جات

[i] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، افکار و آثار، ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، الہدایہ اسلامک ریسرچ سینٹر، راجستھان، انڈیا، سن اشاعت ۲۰۰۰، صفحہ نمبر: ۱۳ تا ۲۰

Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Thoughts and Works, Dr. Muhammad Saud Alam Qasmi, Al Hudayah Islamic Research Center, Rajasthan, India, Publication Year 2000, Page No.: 13 to 20

[ii] بلال عبدالحی حسنی ندووی، سوانح مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن ندوویؒ، مجلس نشریاتِ اسلام ا۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر ا، کراچی ص: ۴۷۔۷۹

Bilal Abdul Hai Hosni Nadvi, Biography of the Islamic thinker Hazrat Maulana Abul Hasan Nadvi, Majlis-i-Islam Broadcasting House, K. 3, Nazimabad Mansion, Nazimabad No. 1, Karachi, pp. 47-79.

[iii] ایضا: ص: ۱۰۰-۱۳۷

Also: pp. 100-137

[iv] ایضا: ۱۲۴-۱۳۴

Also: 124-134

[v] مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن ندوویؒ نمبر، مرکز دعوت وارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی ہند، شمارہ ۲۳، ۲۲، ۲۱، جولائی ۲۰۰۰ء، تا جون ۲۰۰۱ء۔ ص: ۳۳۸۔۳۳۹

The thinker of Islam, Hazrat Maulana Abul Hasan Naduwi, No., Center for Da'wat and Irshad, Darul Uloom Al-Islamiya Basti, UP India, No. 21, 22, 23, July 2000, to June 2001. P. 338. 339

[vi] جعفر مسعود حسنی ندووی، حضرت مولانا ابوالحسن ندوویؒ ماہ و سال کے آئینے میں، سہ ماہی فکر اسلامی، دارالعلوم الاسلامیہ بستی، یوپی، الہند جولائی ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء

Jafar Masood Hosni Nadowi, Hazrat Maulana Abul Hasan Nadowi in the Mirror of Month and Year, Islamic Thought Quarterly, Darul Uloom al-Islamiya Basti, UP, India July 2000 to June 2001

[vii] مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن ندوویؒ نمبر، مرکز دعوت وارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی ہند، شمارہ ۲۳، ۲۲، ۲۱، جولائی ۲۰۰۰ء، تا جون ۲۰۰۱ء۔ ص: ۱۵۳

The thinker of Islam, Hazrat Maulana Abul Hasan Nadavi, No., Center for Da'wat and Irshad Darul Uloom Al-Islamiya Basti, UP India, No. 21, 22, 23, July 2000, to June 2001. P.: 153

[viii] مولانا مودودی، بحوالہ خورشید احمد، ترجمانِ القرآن، اپریل ۱۹۴۲، جلد ۲۰، عدد ۲، ادبیاتِ مودودی (لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۵) ص: ۲۲۸، ۲۲۹

Maulana Maududi, quoted by Khurshid Ahmad, Interpreter of the Qur'an, April 1942, Volume 20, Number 2, Literature of Maududi (Lahore, Islamic Publications, 1985), pp. 228, 229

[ix] محمد ارشد، سید احمد بریلوی اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد کے تین وقائع نگار سید ابوالحسن ندووی، مسعود عالم ندووی، غلام رسول مہر، فکر و نظر۔ جلد ۵۳، شمارہ ۱، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد

Muhammad Arshad, Syed Ahmed Barelvi and three chroniclers of their Tehreek Islahu Jihad, Syed Abul Hasan Nadavi, Masood Alam Nadavi, Ghulam Rasool Mehr, Fiqr and Nazar. Volume 53, Issue 1, Institute of Islamic Research, Islamabad.

[x] عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح، ابوالحسن علی ندوی، دار عرفات، گوئن روڈ، لکھنؤ، طبع دوم ۱۹۸۰ئ، ص ۲۳

Understanding and Interpreting Religion in the Modern Age, Abu Al-Hasan Ali Nadvi, Dar Arafat, Guin Road, Lucknow, Second Edition, 1980, p. 23

[xi] John L. Esposito, The Oxford Dictionary of Islam, p 226. ISBN 0-19-512559-2

[xii] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، افکار و آثار، ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، الہدایہ اسلامک ریسرچ سینٹر، راجستھان، انڈیا، سن اشاعت ۲۰۰۰، صفحہ نمبر: ۲۰

Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Thoughts and Works, Dr. Muhammad Saud Alam Qasmi, Al Hudaya Islamic Research Center, Rajasthan, India, Publication Year 2000, Page No: 20

[xiii] https://web.facebook.com/MuntakhabKutub/photos/a.621428971671481/755236251624085/?type=3&__rdc=1&__rdr

[xiv] David Arnold, Stuart H. Blackburn, Telling Lives in India: Biography, Autobiography, and Life History, p 127. ISBN 0-253-21727-X

[xv] Syed Zia ur Rehman، My Family, We and You (A monthly magazine)Maulana Ali Mian – Life, Works and Association with، Aligarh, اپریل ۲۰۰۰، 1-16p.

[xvi] شکری فیصل / سید محمد الحسنی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مولانا سید ابوالحسن علی ندووی حیات وافکار کے چند پہلو، (ترتیب و تدوین: سفیر اختر) ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، ص: ۹۷

Shukri Faisal/Syed Muhammad Al-Hasani, The Impact of the Rise and Fall of Muslims on the Human World, Some Aspects of Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadavi's Life and Thoughts, (Edited by: Sefir Akhtar), Institute of Islamic Research Islamabad, p. 97

[xvii] مولانا ابوالحسن ندووی، عالم عربی کا المیہ، مجلس نشریات اسلام، ۱-کے-۳، ناظم آباد ۱، کراچی ۱۸۔ دیباچہ دوم

Maulana Abul Hasan Naduwi, Tragedy of Alam Arabi, Majlis Nashaat Islam, A-K-3, Nazimabad 1, Karachi 18. Preface II

[xviii] عالم عربی کا المیہ، ابوالحسن ندوویؒ، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد نمبر ۱، کراچی نمبر ۱۸، سن اشاعت ۱۹۸۰ء، بار سوم، صفحہ نمبر۔ ۵۳

The Tragedy of the Arab World, Abul Hasan Naduwi, Majlis-e-Nashat-e-Islam, Nazimabad Mansion, Nazimabad No. 1, Karachi No. 18, Publication Year 1980, Third Edition, Page No. 53.

[xix] https://abulhasanalinadwi.org/books/Akhlaaq%20e%20europe.pdf

[xx] https://www.dailysalar.com/news/22862/page8/

[xxi] http://zahidrashdi.org/658

[xxii] مولانا کے دعوتی اصول، (علامہ یوسف قرضاوی)، ترجمہ: محمد سلمان ندووی، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن ندوویؒ نمبر، مرکز دعوت وارشاد دارلعلوم الاسلامیۃ بستی یوپی ہند، شمارہ ۲۳، ۲۲، ۲۱، جولائی ۲۰۰۰ء، تا جون ۲۰۰۱ء۔ ص: ۲۰۷

Maulana's Dawati Usool, (Allama Yusuf Qaradawi), translated by: Muhammad Salman Naduwi, the thinker of Islam, Hazrat Maulana Abul Hasan Naduwi, No., Center for Da'wat and Irshad Darul Uloom al-Islamiya Basti, UP India, Issue 21, 22, 23, July 2000, to June 2001. Pg: 207

[xxiii] مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۳ئ، طبع پنجم، ص: ۸۱-۷۳۔

The struggle between Islamism and Westernization in Muslim countries, Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Majlis Research and Broadcasting of Islam, Lucknow, 2003, fifth edition, pp. 81-73.

[xxiv] حوالہ سابقہ، ص ۱۳۷۔۱۳۸

Ibid pp. 137-138

[xxv] حوالہ سابقہ، ص ۱۴۴۔۱۴۶

Ibid. 144-146

[xxvi] حوالہ سابقہ، ص۱۵۲۔۱۵۴

Ibid pp. 152-154

[xxvii] حوالہ سابقہ، ص۱۴۸، حاشیہ

Ibid p. 148, margin

[xxviii] سنن النسائی، احمد بن شعیب النسائی، کتاب البیعۃ، فضل من تکلم بالحق عند امام جائر، مکتب المطبوعات الاسلامیہ، بیروت، ۱۹۹۴، حدیث نمبر:۴۲۰۹، جلد:۷، صفحہ:۱۶۱

Sunan al-Nasa'i, Ahmad bin Shu'ayb al-Nasa'i, Kitab al-Bayyah, Fazl min Taklam bil Haq at Imam Jair, Maktab al-Matabat al-Islamiyya, Beirut, 1994, Hadith No.: 4209, Volume: 7, Page: 161

[xxix] حوالہ سابقہ، ص۲۰۷۔۲۰۸

Ibid., pp. 207-208

[xxx] حوالہ سابقہ، ص۹۵۔۹۶

Ibid, pp. 95-96

[xxxi] حوالہ سابقہ، ص۹۹

Ibid, p. 99

[xxxii] https://abulhasanalinadwi.org/books/Khaksaar%20Movement.pdf

[xxxiii] قادیانیت۔ مطالعہ وجائزہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، سنہ اشاعت ندارد، ص۸

Qadianism. Study and review, Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Majlis Nashaat-e-Islam Karachi, year not published, p. 8

[xxxiv] حوالہ سابقہ، ص۶۵۔۶۶

Ibid, pp. 65-66

[xxxv] حوالہ سابقہ، ص۱۳۷

Ibid, pp.137

[xxxvi] حوالہ سابقہ، ص۱۵۰۔۱۵۱

Ibid, pp.150-151

[xxxvii] دین اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حاجی عارفین اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۵ئ، ص۷۔۸

Religion of Islam and Two Contrasting Images of Early Muslims, Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Haji Arifin Academy, Karachi, 1985, pp. 8-7

[xxxviii] حوالہ سابقہ، ص۲۰

Ibid, pp. 20

[xxxix] حوالہ سابقہ، ص۲۱۔۲۲

Ibid, pp. 21-22

[xl] حوالہ سابقہ، ص۱۲۵۔۱۲۶

Ibid, pp. 125-126

[xli] محمد صدیق خان شبلی، نقوشِ اقبال سید ابوالحسن علی ندووی کی اقبال شناسی پر ایک نظر، مولانا سید ابوالحسن علی ندووی حیات وافکار کے چند پہلو، (ترتیب وتدوین: سفیر اختر) ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، ص:۱۴۸-۱۵۳

Muhammad Siddiq Khan Shibli, A look at Naqosh-e-Iqbal Syed Abul Hasan Ali Nadavi's Iqbal knowledge, A few aspects of Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadavi's life and thoughts, (Compiled and edited by: Sefir Akhtar), Institute of Islamic Research Islamabad, pp. 148-153

http://alsharia.org/2010/apr/syed-abulhasan-ali-nadvi-fikri-imtiazaat-dr-ghitreef-nadvi[xlii]